یکم اگست ۱۹۷۰ء

ہفت وار
ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۹

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۸)

میں جب امریکہ پہنچا ہوں تو ادبی حلقوں میں "HAIR" کا بہت چرچا تھا۔ اسے مصنفین جیروم رگنی (Gerome Ragni) اور جیمس راڈو (James Rado) نے امریکی قبائلی محبت کا راک میوزیکل (Rock musical) کہا ہے۔ جو لوگ ڈرامے میں صاف ستھری حقیقت نگاری اور باقاعدہ ترشے ہوئے ایکٹ اور سین، کردار، کشمکش اور ایک خاص خیال کا ارتقا ڈھونڈھتے ہیں، انھیں اس ڈرامے کو پڑھ کر بڑی الجھن ہوگی۔ اس کے لئے اوّل تو راک موسیقی کی دھنوں اور ان کے غیر معمولی تاثر سے ایک حد تک آشنا ہونا ضروری ہے، دوسرے جدید ڈرامے میں جس طرح اداکاروں اور دیکھنے والوں کے درمیان ایک رشتہ قائم کیا گیا ہے اسے ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس ڈرامے میں پچیس اداکار کام کرتے ہیں۔ دس خاص کردار ہیں جن میں سے دو ابا اور اماں چھتیس برس کے ہیں اور بوڑھی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باقی سترہ سے پچیس سال تک کی عمر کے ہیں اور موجودہ نسل کی خصوصیات ظاہر کرتے ہیں۔ سب لمبے بال رکھتے ہیں۔

تمہید میں ڈرامے کا تعارف اس طرح ہوا ہے:

"مارشل میک لوہن آج کی دنیا کو گردی گاؤں (Global village) کہتا ہے اور آج کا نوجوان اجتماعی قبائلی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس لئے (HAIR) بھی ایک اجتماعی قبائلی سرگرمی ہے۔ یہ جو کچھ (دنیا میں) ہو رہا ہے اس کی توسیع ہے۔ ایک مشترک مقصد کے لئے ملنا، ایک ایسے طرز زندگی کی تلاش جو نوجوانوں کے لئے معنی رکھتا ہے جو ان کی نئی بصیرت کے فروغ کا موقع فراہم کرتا ہے، خواہ یہ نئی بصیرت واضح حد بندی رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ HAIR کا مقصد پرانی نسل کی منزل، ناقابل قبول معیار اور اخلاق کا بدل تلاش کرنا ہے۔ یعنی برسر اقتدار طبقے یا (ESTABLISHMENT) کی منزل، معیار اور اخلاق کا بدل۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ مقصد کبھی پورا ہوگا یا نہیں۔ بہرحال آج جو ہو رہا ہے صرف اس کی اہمیت ہے۔ قبیلے یا ٹولیاں بن رہی ہیں، اپنی زندگی گزارنے کا طریقہ بنا رہی ہیں، اپنے اخلاق، اپنی آئیڈیالوجی، اپنے لباس، عادات اور نشیلی دواؤں کے استعمال کی وجہ سے قدیم تہذیبوں میں ان کے متوازی قبائلی روحانی کیفیت کے نمونے مشرق

اور مغرب دونوں میں مل جاتے ہیں۔

سترہ سے پچیس سال تک کے نوجوان جو قبیلہ (۱۹۶۷ء) کہلاتے ہیں، ایک ایسی زندگی کے خواہش مند ہیں جو موجودہ زندگی سے بہتر، زیادہ صحت مند، پرامن اور محبت سے بھرپور زندگی ہے۔ وہ یہ زندگی بسر بھی کر رہے ہیں اور اس کو اسٹیج پر دکھا کر تماشائیوں کو اس میں شریک بھی کر رہے ہیں۔ اس کھیل میں بیرونی خلا (OUTER SPACE)، علم نجوم، زمین اجرام فلکی، سیاروں کے درمیان سفر، تصوف، خاص خاص گانوں کے ذریعہ سے آتے ہیں۔ بیرونی دنیا سے خطرہ پولیس کی گشت چلوں، ایف بی آئی، سی آئی اے، کچھ پر اسرار آدمیوں اور ابّا اور امّاں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ڈرامے میں دو ایکٹ ہیں۔ ہر ایکٹ میں تیرہ چودہ گانے ہیں۔ ہم ایسے ڈرامے کے عادی ہیں جو ادب بھی ہو۔ یہ ڈرامہ ادب نہیں، تھیٹر اور اس کے اثرات کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے۔ پلاٹ برائے نام ہے۔ صرف قبیلہ موجودہ زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کبھی گانوں کے ذریعہ سے، کبھی مکالمے کے ذریعہ سے ظاہر کرتا رہتا ہے۔ قبیلے کے افراد فوج میں بھرتی کے کارڈ جلاتے ہیں۔ ویت نام کے خلاف ہیں، برسر اقتدار طبقے کے خلاف ہیں۔ پرانے امریکہ کے ناولوں اور ریڈ انڈین قبیلوں کے بعض طریقوں کو اپناتے ہیں جس کے متعلق ان کا رویہ بھی عام لوگوں سے مختلف ہے۔ مگر یہ ڈرامہ سیاسی زیادہ ہے جیسی کہ قبیلے کا ایک کورس دیکھئے:

ہم کیا چاہتے ہیں ؟

امن

ہم یہ کب چاہتے ہیں ؟

ابھی

ہم کیا چاہتے ہیں ؟

آزادی

ہم یہ کب چاہتے ہیں ؟

ابھی

بعض لوگوں کے نزدیک (ہیئر) محض ایک عارضی میلان کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی معنویت زیادہ گہری نہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک اہم کوشش ہے ڈرامے اور گانے کے ذریعہ تماشائیوں میں موجودہ سماجی نظام کے خلاف جذبات ابھارنے کی۔ اب تماشائی صرف ڈراما نہیں دیکھتا، وہ ڈرامے میں شریک ہوتا ہے۔

ایک اور ڈراما جو چھ یا پانچ سال پہلے لکھا گیا تھا، مگر امریکہ میں اسے کامیابی سے اسٹیج کیا گیا۔ مرات، ساد۔ آرتو (Marat / Sade / Artaud) ہے۔ یہ پیٹر وائس نے لکھا ہے۔ بظاہر یہ نپولین کے زمانے میں ایک پاگل خانے کے مریضوں کے لئے ساد کے ۱۸۰۸ء کے ایک کھیل کا نیا روپ ہے مگر دراصل اس میں انقلاب فرانس پر ساد اور مرات کی بات چیت کے پردے میں، جدید تاریخ کی نفسیاتی اور سیاسی بنیادوں پر بحث ہے جس میں تازہ دور کے قید خانوں کے تجربات بھی در آتے ہیں۔ یہ ڈراما ادب بھی ہے، اس میں جا بجا ایسے جملے اور فقرے ملتے ہیں جو ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں پھر یہ بہت کامیاب ڈراما ہے اور مجموعی طور پر پاگلوں کے رد عمل کے ذریعہ سے زندگی کے اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی جو بقول فانی ذہن جاسکتا ہے نہ سمجھایا جاسکتا ہے۔ پیرانڈلو اور بریخت میں ایک مماثلت ملتی ہے۔ بریخت کی تکنیک کو یہاں بھی کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے جو بانی صرف کچھ کہتی نہیں وہ اس پر چھا بھی جاتی ہے۔ ویسے بریخت اور آرتو کے نقطۂ نظر میں بنیادی فرق ہے یہاں صرف اثر کا ذکر مقصود ہے۔

(باقی)

۱۹۷۱ء کے عازمین حج کی اطلاع کیلئے

ایسا دیکھا گیا ہے کہ عازمین حج اعلان میں دی ہوئی ہدایات پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔

عازمین حج کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ زمرہ ۲ اور ۳ میں ترجیح حاصل کرنے کے لئے اپنی تازہ درخواست کے ساتھ گذشتہ برسوں کی نامنظور شدہ درخواستوں کے فارم بھی منسلک کردیں۔ کسی خط کے منسلک کرنے یا سابقہ رجسٹریشن نمبر کا حوالہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس صورت میں ایسی درخواستیں زمرہ زیریں میں درج کی جائیں گی۔

• اسسٹنٹ منیجر مغل لائن لمیٹڈ بمبئی

زاہدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ "زہر حیات"

زاہدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ "زہر حیات" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ یہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قیمت پانچ روپے ہے۔

• نامہ نگار

مزاحیہ ڈرامے

ملک کے ممتاز ڈرامہ نگار اظہر افسر کے بارہ مزاحیہ ڈراموں کا ایک دلکش مجموعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ کی جانب سے شائع ہو گیا ہے۔ کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔

• نامہ نگار

محمد انصار اللہ

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ

ایک جائزہ

اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ نے سالِ گذشتہ "دیوانِ غالب بخطِ غالب" کا صفحہ بہ صفحہ عکس مقدمہ اور حواشی کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر بہت خوبصورتی کے ساتھ ادارہ یادگارِ غالب رامپور سے "نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے شائع کیا۔ اصل مخطوطہ دیکھنے کا راقم سطور کو موقع نہیں مل سکا ہے البتہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے ازراہِ کرم "نسخۂ عرشی زادہ" مجھے عنایت کیا۔ اس کو دیکھنے کے بعد جو خیالات ذہن میں پیدا ہوئے انھیں قلمبند کرتا ہوں۔

جب بھی کوئی نئی چیز غیر متوقع طور پر دستیاب ہوتی ہے تو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے اور ایسے مواقع پر اکثر بعض ضروری پہلو قدرتی طور پر نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ دیوانِ غالب بخطِ غالب جب دریافت ہوا تو نقاد اکبر آبادی صاحب نے ۸ رمئی ۱۹۶۹ء کے "ہماری زبان" میں ایک مراسلہ اس بابت شائع کیا۔ اس میں اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ:

"ہو سکتا ہے کہ غالب کے کلام کا یہ مخطوطہ کسی تجربہ کار کاتب کا لکھا ہوا ہو"

شبہ غیر فطری نہ تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو پر بھی علمی انداز سے غور کرنے کی ضرورت تھی لیکن غالباً کوئی علمی بحث اس انداز سے نہیں کی گئی اور یہ مسئلہ ہنوز غور طلب ہے۔ نقاد صاحب کے مراسلے کا جواب اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ نے یکم رجون ۱۹۶۹ء کے "ہماری زبان" میں شائع کیا۔ انھوں نے لکھا:

"بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کی جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گذری ہوں، یعنی ڈیڑھ ہزار سے بھی اوپر اردو، فارسی نظم و نثر کی تحریریں...... اس لئے اگر غالب کے اس دیوان کے بارے میں میں یہ کہوں کہ یہ غالب کے اپنے قلم کا نقل کیا ہوا ہے تو اس دعوے میں میرا تجربہ شاید ہی مجھے دھوکا دے...... اصل نسخے کے ترقیمے میں سنہ کے اعداد درج ہونے سے رہ گئے ہیں لیکن مختلف شہادتوں سے جناب عرشی صاحب اور میں نے یہ سنہ متعین کیا ہے۔"

زیرِ نظر دیوان میں غالب کا مستند کلام بھی ملتا ہے اور کچھ نیا کلام بھی موجود ہے۔ ترقیمہ میں "فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد غفر اللہ عنہ" بھی لکھا ہوا ہے۔ ایسے قرائن بھی موجود ہیں جن کی بنیاد پر مولانا امتیاز خاں عرشی جیسے ماہرِ غالبیات نے اس مخطوطہ کا زمانۂ کتابت ۱۲۳۱ھ متعین کیا۔ ظاہر ہے کہ اس دیوان کے کاتب کا "انداز خط" مرزا کے انداز خط سے بہت زیادہ مماثل ہونا چاہئے۔ یہ نسخہ چونکہ مرزا کی نوجوانی بلکہ "کمسنی" میں لکھا گیا اس کے انداز خط میں بعض ایسی صورتیں بھی موجود ہونی چاہئیں جو اس کی قدامت پر دال ہوں۔ اس میں جو کلام ہے وہ لازماً مرزا کے لڑکپن کا ہونا چاہئے۔ اتنی باتیں تو اس میں لازماً متوقع ہیں، لیکن محض ان امور کا وجود اس کے مستند اور قدیم ہونے کے لئے کافی ثبوت نہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ خصوصیات جو مرزا کے کلام میں نہیں پائی جاتیں زیرِ نظر نسخے میں دستیاب ہونے والے نئے کلام میں بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ باتیں جو مرزا کی تحریروں میں نہیں ملتیں زیرِ نظر مخطوطے کی تحریر میں بھی نہیں ہیں۔ مرزا نہایت ذہین شخص تھے ان کی تحریریں بھی ارتقائی صورتیں ملتی ہیں۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جو خصوصیات مرزا کی تحریر میں بعد میں پیدا ہو گئی تھیں زیرِ نظر نسخے میں نہیں پائی جاتیں۔ اس طور پر اگر تعصبات سے بالاتر ہو کر اس نسخے کا مطالعہ کیا جائے تو حقائق بہتر طور پر سامنے آسکیں گے۔ مثال کے طور پر "نسخۂ عرشی زادہ" کے ابتدائیہ میں ہے:

"سرِ صفحے پر "دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ" بھی میرا اضافہ ہے۔ یہ عبارت غالب کی مختلف اصل تحریروں سے عکس کرا کے مرتب کی گئی ہے اور غالب کے اندازِ خط کی آئینہ دار ہے۔ حسنِ اتفاق ہے کہ غالب کے قلم سے لکھا ہوا میرا نام بھی مل گیا چنانچہ سرورق پر یہ بھی غالب کے خط ہی کا عکس ہے۔" (ص ۱۳)

ظاہر ہے کہ اب ان تحریروں میں تمام خصوصیات موجود ہیں جو غالب کی تحریریں ہیں لیکن یہ عبارت فی الواقع غالب کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمیں دوسرے پہلو سے ان تحریروں کو دیکھنا ہوگا اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو غلط فہمی کا شکار ہو جانا یقینی ہے۔

زیرِ نظر نسخے کے زمانۂ کتابت کا تعین کرنے کے لئے مختلف شہادتوں کا نہیں، صرف دو امور کا بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ "زیرِ نظر نسخے کے حاشیہ صفحہ ۸ پر ۱۱ صفر ۱۲۳۵ھ کی ایک یادداشت بخطِ غالب درج ہوئی ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ یہ نسخہ مذکورہ یادداشت کی معینہ تاریخ سے بہرصورت پہلے تیار ہو چکا تھا۔"

(مقدمہ ص۱۱)

یادداشت کی بابت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی باتیں شامل ہوتی ہیں۔ آئندہ

کے پروگرام، ماضی کی یادیں، حال کے واقعات سبھی کچھ یادداشت کی ذیل میں آجاتے ہیں۔ بزرگوں سے سنی ہوئی باتیں، کتابوں اور بیاضوں میں محفوظ تحریریں، آنکھوں دیکھی وارداتیں قلمبند کرلی جائیں تو یہ سب یادداشت کی ذیل میں آجائیں گی۔ یادداشت میں عموماً اشاروں سے کام لیا جاتا ہے، تفصیل مذکور کرنا ضروری نہیں۔ ان اشاروں کا تاوقتیکہ دوسرے شواہد موجود نہ ہوں سمجھ لیا جانا بھی آسان نہیں۔ ایسی صورت میں کسی یادداشت پر اعتماد کرکے نسخہ کے زمانہ وسال کا تعین کرلینا مناسب نہیں۔ مذکورہ یادداشت یہ ہے:

مسمّی علی خاں بتاریخ اول صفر ۱۲۳۰ھ

درماہہ

عہ

اس مختصر سی تحریر سے یہ مطلب نکال لینا کہ علی خاں نامی کسی شخص کو مرزا غالب نے پہلی صفر ۱۲۳۰ھ کو ملازم رکھا تھا تاوقتیکہ دوسرے ذرائع سے مستحکم ثبوت نہ مل جائے ایک قیاسی بات ہوگی اور اس قیاس کو واقعہ کا درجہ دینا مناسب نہ ہوگا۔ پہلے تو اس بات کا ثبوت تلاش کرنا ہوگا کہ یہ یادداشت اول صفر ۱۲۳۰ھ ہی کو لکھی گئی تھی اور ایسا نہیں ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ سے نقل کیا گیا ہو یا یہ ماضی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کا بعد میں جب ذکر آیا تو اس وقت اسے قلمبند کرلیا گیا۔ پھر اگر ایسا ہو بھی تو اس بات کے لئے کیا ثبوت ہوگا کہ یہ تحریر خود غالب کے ہاتھ کی ہے؟ محض یہ بات کہ یہ تحریر دیوان غالب پر ملتی ہے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں۔ خود مرتب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ حاشیہ کے بیشتر اندراجات "بخط غیر" ہیں۔ یادداشت کا انداز خط معمولی اور معروف ہے اور اس بات کا بخوبی امکان ہے کہ یہ بھی "بخط غیر" ہی ہو۔ قیاسات پر حقائق اور واقعات کی بنیاد قائم نہ کی جانی چاہئے۔

۲۔ "زیر نظر نسخے کے تمام مقطعوں میں صرف اسدؔ تخلص استعمال ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی جگہ غالبؔ تخلص رکھنے کی سعی میں مصرع کی شکل تبدیل کی گئی ہے۔۔۔۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب تخلص کا طے پانا سنہ ۳۴ اور جب ۱۲۳۱ھ کے بعد جو زیر نظر نسخے کی تاریخ ترتیب ہے اور ۱۲۳۱ھ کے تمام ہونے سے قبل عمل میں آچکا تھا۔"

(مقدمہ ص۱۱)

اس دلیل میں وزن ہے۔ تقویم کی مدد سے یہ بھی دریافت ہوا ہے غالب کی زندگی میں اس دن وہ تاریخ دوسرے برسوں میں بھی آئی ہوگی ان سب کو اس بنا پر نظر انداز کیا گیا کہ ۱۲۳۱ھ کے خاتمہ سے پہلے مرزا اسدؔ تخلص ترک کرکے غالبؔ تخلص اختیار کرچکے تھے اس قیاس کے قابل لحاظ ہونے کے باوجود مسئلہ پر مزید غور وفکر کی ضرورت ہے یہ اس لئے کہ اگر نقاد اکبر آبادی صاحب کے شجرہ میں ادنیٰ صداقت بھی ہوئی تو یہ دلیل بے وزن ہوکر رہ جائے گی۔ مخطوطات کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھی ان کے نقل کرنے میں اہتمام کیا جاتا ہے کہ اصل کے اغلاط اس پر مندرج اصلاحیں، اس کے حواشی، اس کا ترقیمہ بھی کچھ من وعن نقل ہوجائے۔ یہ اہتمام عقیدت اور ضرورت دونوں سبب سے ہوتا ہے۔ مرزا کا حلقۂ احباب ہمیشہ بہت وسیع رہا ہے، اس بات کا بخوبی امکان ہے کہ ان کے کسی دوست یا عقیدت مند نے ان کے دیوان کا کوئی قدیم ترتیب حاصل کی ہو۔ اسی نوعیت کے اور امکانات بھی ہوسکتے ہیں۔ ان سب کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مرتب کے نزدیک صرف متن "بخط غالب" ہے اور حاشیہ من حیث الاکثر "بخط غیر" ہے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے،

"زیر نظر نسخے کے حاشیوں پر بھی چودہ غزلیں اضافہ ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی بخط غالب نہیں"

(مقدمہ ص۲۱)

اور اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ

"یہ تمام غزلیں متن کے خط سے مختلف خط میں ہیں، ان غزلوں میں املا کی متعدد فاحش غلطیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے ناقل کی کم سوادی بتاتی ہیں۔"

(مقدمہ ص۱۲)

ان فاحش غلطیوں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے البتہ خط کا فرق بظاہر صرف اتنا ہے کہ متن کی کتابت بہ اطمینان اور بہ اہتمام کی گئی ہے اور حواشی کی کتابت میں یہ اہتمام نہیں ہے۔ ان کا خط زیادہ شکستہ ہے ورنہ ظاہرا حروف کی اصولی ساخت بڑی حد تک مماثل ہے۔ غالبؔ

سید فضل المتین

غزل

سفر سے دن کے میں لوٹا ہوں جب بھی شام ڈھلے
اندھیرے گھر میں ملی روشنی چراغ تلے

جلائے اپنی چتا آپ روشنی کے لئے
اندھیرے راستوں پہ کون میرے ساتھ چلے

اٹھی ہے عہد گذشتہ کے روشنی پھیلے
کسی طرح شب امروز جائے آج ٹلے

سلگتے جائیں یونہی خواہشوں کی آگ میں ہم
وہ سخت جان بھی دیکھیں کبھی گلے نہ گلے

وہ جس سے ایک تعلق تھا جسم وجاں کی طرح
ہمارے سامنے اب کوئی اس کا نام نہ لے

کسی کے واسطے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
ہماری طرز سے کوئی اگر جلے تو جلے

اب ان کا زہر بھی کیوں نہیں چڑھے گا متینؔ
یہ سانپ اپنی ہی آستین میں ہیں پلے

یہ مماثلت ہی ہے جس کے سبب مرتب نے یہ کہا کہ

"میرا خیال ہے کہ یہ خط کسی ایسے شخص کا ہونا چاہئے جو غالب کے بہت قریب ہو اور ممکن ہے ان کے ساتھ ہی رہتا ہو اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا خط ہو"

(مقدمہ ص۱۸)

لیکن یہ استدلال عجیب ہے، قریب ہونے سے ساتھ رہنا اور ساتھ رہنے سے چھوٹا بھائی ہونا کیونکر لازم آیا یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ ظاہرا یہ قیاس مسئلہ کی پیچیدگی سے بچنے کے لئے کیا گیا کیونکہ

"زیر نظر نسخے کے تمام مقطعوں میں صرف اسد تخلص استعمال ہوا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی متن میں غالب تخلص نہیں ملتا" (مقدمہ ص۱۱)

اور حاشیہ پر پانچ غزلوں میں غالب تخلص (بجائے اسد) ملتا ہے ان کے مقطع یہ ہیں۔

۱۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں
۲۔ پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
۳۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
۴۔ سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
۵۔ سمجھا دو اسے یہ وضع چھوڑ دے

اور ان میں اول الذکر غزل وہ ہے جس میں مرزا نے ضعیفی و پیری کے مضامین صرف کئے ہیں اس لئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حاشیہ پر اضافہ و اندراج کا سلسلہ مرزا کے زمانۂ شیب تک جاری رہا یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ یہ نسخہ جس شخص کے پاس بھی رہا اسے عزیز تھا اور با احتیاط محفوظ رکھا گیا تھا۔ ۱۲۳۱ھ کے کچھ عرصے کے بعد مسترد کر کے اسے ضائع نہیں کیا گیا۔ مسترد کئے جانے کا خیال ہوتا تو مخطوطہ پر بے احتیاطی کے سبب شکنوں وغیرہ کا پڑ جانا، بعض صفحات کا ضائع ہو جانا وغیرہ بھی مستبعد نہ تھا۔

یہ بات کہ حاشیہ کی غزلوں کا تخلص متن پر نہیں ہے اس بات کا تو ثبوت ہے کہ متن کی کتابت مکمل ہو جانے کے بعد حواشی کی کتابت ہوئی لیکن اس سے ان کا "بخط غیر" ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ صفحہ ۹۴ پر ایک مقطع ظاہرا اسی خط میں تحریر ہوا ہے جو حاشیہ کی غزلوں کا ہے، اسی صفحہ پر اصلاح کے بعد ایک مصرع حاشیہ پر لکھا گیا ہے۔ ظاہرا ان دونوں کا انداز خط متن کے خط سے مختلف ہے لیکن اس کے باوجود مرتب ان کو "بخط غالب" تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات مرتب کے فیصلہ کی بابت مذکورہ خیال کی مؤید ہے کہ کاتب کی "کم سوادی" کا اندازہ متن اور حاشیہ دونوں کی تحریروں کے بغور مطالعہ کے بعد ہی ممکن ہے۔ مرتب نے حاشیہ کی تحریروں کو اپنی بحثوں میں نظر انداز کر دیا ہے البتہ متن کے خط کی بابت انھوں نے لکھا ہے،

"زیر نظر نسخے کا انداز خط خوبصورت شکستہ آمیز نستعلیق، اور از اول تا آخر یکساں ہے، اس کی پختگی بتاتی ہے کہ لکھنے والے نے ابتدا ہی سے باقاعدہ کسی استاد کے سامنے مشق کی ہے چنانچہ یہ خوش خطی کے اعتبار سے بھی استادانہ شان رکھتا ہے۔"

(مقدمہ ص۱۹)

مخطوطہ کی ضخامت سوا سو صفحات ہے یہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے لکھنے میں کاتب کو کئی دن لگے ہوں، کئی دن تک مسلسل لکھنے کے باوصف انداز خط کا اول سے آخر تک یکساں قائم رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ تحریر میں "پختگی" تھی اور کاتب "استادانہ شان" رکھتا تھا۔ اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد اس بات کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے کہ ایک مختصر عرصے میں (زیادہ سے زیادہ چار سال) انداز خط میں کوئی قابل ذکر تبدیلی پیدا ہو جائے لیکن تعجب یہ ہے کہ زیر نظر نسخے کے متن کا خط غالب کے "آشنا خط" سے مختلف ہے، مرتب نے اس بارے میں اس طرح خیال آرائی کی ہے۔

"یہ انداز خط غالب کے آشنا خط سے مماثلت رکھتے ہوئے بھی زیر نظر نسخے کی اصلاحوں کے خط سے قدرے مختلف ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ زیر نظر نسخہ غالب نے ۱۹ برس کی عمر میں نقل کیا تھا اور اصلاحوں کا عہد اندازاً چار برس کا زمانہ ہے اس اندازے کی بنیاد یہ ہے کہ زیر نظر نسخے پر ۱۲۳۵ھ کی یادداشت کے قلم کا قط اور روشنائی (کذا) کے رنگ سے بے حد ملتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اصلاحیں بھی تقریباً ۱۲۳۵ھ ہی کی ہے ...... ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ چار سال کے عرصے میں ایک خفیف سا فرق غالب کے انداز خط میں پیدا ہوا یعنی شکستہ پن میں کمی آئی ہے اور پھر یہی ۱۲۳۵ھ کا انداز ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا۔"

(مقدمہ ص۱۹)

اس اقتباس میں تین تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے ۱۔ متن۔ ۲۔ اصلاحیں۔ ۳۔ یادداشت اور بنیادی اہمیت یادداشت کو دی گئی ہے جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ یادداشت کے قلم کا قط (لفظ "دو ماہ" زیادہ صاف ہے اس پر نگاہ کی جائے) ایک ملی میٹر کے قریب ہے، اس کے بالمقابل صفحہ ۸۰ پر "میر محیط ہیں" غالب اصلاح کے بعد لکھا گیا ہے، اس کے قلم کا قط ایک ملی میٹر سے کچھ کم ہے دونوں میں تقریباً دگنے کا فرق ہے، اصلاح نہایت روشن اور واضح ہے، یادداشت کی روشنائی نسبتاً کافی ہلکی ہے جیسا کہ

مرتب کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں کا قلم مختلف اور دونوں کی روشنائی جدا ہے، یادداشت کا انداز خط بھی زیادہ شکستہ ہے اس طرح اس قیاس کے لئے بھی گنجائش ہے کہ دونوں کا زمانہ تحریر مختلف ہو اور چنانچہ دونوں کے کاتب بھی الگ الگ لوگ ہو سکتے ہیں، اصلاح اور یادداشت کو اس لحاظ سے بھی رلا دینا بہت صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح اصلاحوں کا زمانہ ۱۸۱۶ء متعین کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

صفحہ ۳۹ پر مقطع کا مصرع ثانی اس طرح لکھا تھا کہ

لیکن اسدؔ بوقت گذشتن جریدہ ہوں

لیکن اسد کو کاٹ کر دوبارہ یہی الفاظ لکھ دئے گئے ہیں، اس اصلاح سے پہلے جو کچھ تھا اس میں کسی تبدیلی کا نہ کیا جانا اس سبب سے ہو کہ کاتب کے نزدیک کسی صورت میں لفظ "اسد" ٹھیک نہ بنا ہو۔

صفحہ ۱۰ پر مقطع کا مصرع اولیٰ بعد تصحیح لکھا گیا اس میں اسدؔ تخلص برقرار ہے کہ

وہ شخص ہوں کہ اسدؔ مضطرب دل نے مجھے

صفحہ ۱۱ پر مقطع کی تصحیح کی گئی اور اس میں اسدؔ تخلص لایا گیا کہ

انداز نارسا دہی سب سمجھ کر پر اسدؔ

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ اصلاحوں کا سلسلہ کتابت سے فرصت پانے کے فوراً بعد شروع کیا جا چکا تھا، کتابت اور اصلاح کے درمیان چند ماہ کا وقفہ بھی شاید ہی حائل ہوا اس قدر مختصر مدت میں اس شخص کی تحریر میں فرق پیدا ہو جانا جو پختگی حاصل کر چکا ہو اور جو اسّی واسطہ شان رکھتا ہو قرین قیاس کم ہے لیکن خود مرتب کو اعتراف ہے کہ انداز خط میں فرق پیدا ہوا اور زیر نظر نسخے میں ایک وہ خط ہے جو غالب کے آشنا خط سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا وہ جو متن میں ہے اور اس سے کسی نہ کسی درجہ میں اختلاف رکھتا ہو یہ صورت حال بہت اہم ہے اور اس پر احتیاط کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ مرتب نے انداز خط سے بحث کرتے ہوئے جو فرق محسوس کئے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ "لفظ 'فقط' کی مختلف شکل زیر نظر نسخے میں غالب کے آئندہ اختیار کئے ہوئے انداز سے مختلف ہے"

۲۔ "زیر نظر نسخے میں الف کی تین شکلیں ملیں گی، ایک سیدھی سادی شکل ۔۔۔۔۔۔ دوسری وہ شکل جس میں الف کے نچلے حصے کو بائیں طرف قدرے موڑ دیا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ تیسری صورت میں الف کی شکل میم کے سرے جیسی ہوگئی ہے۔"

زیر نظر مخطوطے میں پہلی صورت کم تر آتی ہے اور جہاں ملتی ہے وہاں بھی اگر غور کریں تو نچلے حصے کو بائیں طرف موڑ دینے کا رجحان بیشتر ملے گا یہ صورت مرزا کی دوسری تحریروں میں شاید کہیں مل سکے۔ الف کو حرف مابعد سے ملانے کا رواج قدما کے یہاں تھا، مرزا کی دوسری تحریروں میں بھی یہ صورت ہے لیکن حرف میم کے سرے جیسی صورت بنانا نادر ہے۔

۳۔ "کہیں کہیں 'دث' 'ٹی کے' نقطوں کو نوک کے ہندسے کی شکل دے دی ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ شکل آئندہ نہیں ملتی۔"

۴۔ "زیر نظر نسخے میں 'ہے' کی 'ہ' کا سرا میم کے سر کی طرح موٹا ہے اور حرف 'ے' کی بائیں سے دائیں کشش آخر میں مختصر بھی ہے اور خفی بھی لیکن بعد کی تحریروں میں یہ بہت واضح اور مکمل ہے۔"

یائے مجہول کہیں کہیں اتنی مختصر ہو جاتی ہے کہ اس کے وجود پر بھی شک ہونے لگتا ہے، ماقبل کاف سے وصل کی صورت میں وائے قرشت کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آتی ہے یعنی وہ بھی نہایت مختصر ہو جاتی ہے بلکہ کہیں کہیں 'کر' بصورت 'کہ' معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ صورت مرزا کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتی، مرزا کی تحریریں بطور کلی بہت صاف اور واضح ہوتی ہیں، اس حد تک کہ حروف پہچانے جا سکتے ہیں۔

۵۔ "ایک اور مثال گرددں اور گرداب کے 'گ' کی ہے کہ اسے چرخ کھانے کی رعایت سے لٹووں جیسا بنا دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ مثال ان کی طبیعت کا لڑکپن ظاہر کرتی ہے۔"

گردوں کے 'گ' میں بھی املا کی یہ صورت ملتی ہے (ص ۴) لیکن اس کا التزام نہیں ہے، بہرحال جہاں بھی یہ صورت ملتی ہے تحریر کے مصنوعی پن کا احساس ہوتا ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تمام خصوصیات جو مرتب نے متن کی بتائی ہیں کم و بیش حاشیہ کی تحریروں میں بھی مل سکتی ہیں۔

ایک اور خصوصیت جو متن کی تحریر میں ملتی ہے بعض لفظوں میں ایک شوشہ کا اضافہ ہے مثال کے طور پر صفحہ ۴ اور صفحہ ۱۹ پر "پنبہ بالش" کو "پنبۂ بالش" (چار شوشوں کے ساتھ) لکھا ہے، حرف سین میں بھی کہیں کہیں چار شوشے بنائے گئے ہیں چنانچہ صفحہ ۲ پر تماشا، سخت سویدا اور سبل وغیرہ لفظوں میں اس کی مثال ملتی ہے، حاشیہ پر یہ صورت کم تر ملتی ہے اور مرزا کی دوسری تحریریں بھی جیسی کہ ان سے توقع بھی ہے، اس نقص سے پاک ہیں۔

نسخے کی املائی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے بھی مرتب نے بعض اختلافی نکات بیان کئے ہیں۔

۱۔ "ژ کو ہر جگہ ز لکھا ہے مثلاً مژہ، مژگاں وارژدوں کو مزہ، مزگاں، وازدوں لکھا ہے قدما کے یہاں نقطوں کے مقررہ تعداد میں بنانے کا التزام

ذ تھی، غالب کی تحریریں بے منقوط نہیں تھیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ تین نقطے والے حرفوں پر ایک ہی نقطہ بنانے کا التزام کرتے تھے، مرزا کی تحریروں میں صحیح تعداد میں نقطوں کے بنائے جانے کی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں چنانچہ ایک خط پر تاریخ اس طرح لکھی ہے۔ "ہژدہم اپریل ۱۸۵۹ء"

ژ کو ہمیشہ ز لکھنا غیر معمولی اہتمام کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور یہ التزام عام حالات میں غیر متوقع ہوتا ہے۔

۲۔ "گ پر زیر نظر نسخے میں دوسرا مرکز کہیں نہیں استعمال کیا اور ہر جگہ 'ک' ہی املا کیا ہے لیکن 'گل رعنا' کے مورد نسخے میں دونوں صورتیں ہیں۔"

ک اور گ کا معاملہ بھی وہی تھا کہ غیر محتاط روش اس عہد کی تحریروں کا عام مزاج تھا، کبھی گ پر دو مرکز بناتے تھے اور کبھی گ پر صرف ایک مرکز بنانے پر اکتفا کرتے تھے کبھی دونوں پر مقررہ تعداد میں بھی مرکز بنا دیتے تھے، مثال کے طور پر مرزا نے ایک موقع پر لکھا 'تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں'، زیر نظر نسخے میں ہر صورت ایک ہی مرکز کا التزام ہے اور یہ اہتمام کہ کہیں بھی دوسرا مرکز نہ بنے اسی احتیاط کا نتیجہ ہے جس کا ذکر کیا گیا اس احتیاط کی چند مثالیں اور بھی قابل لحاظ ہیں۔

۳۔ تپ کو زیر نظر نسخے میں ہمیشہ 'تب' لکھا ہے مرزا کی دوسری تحریروں میں بالعموم 'تپ' (بہ پائے فارسی یعنی نقطوں کے ساتھ) لکھا ہوا ملتا ہے۔

۴۔ لفظ ہاتھ کو مرزا کبھی ہات، ہاتھ اور کبھی ہاتہ بھی لکھتے ہیں یہ تینوں صورتیں ان کی آخر عمر تک کی تحریروں میں ملتی ہیں، زیر نظر مخطوطے میں پہلی صورت کہیں بھی نظر نہ آئی، آخری صورت عموماً ملتی ہے جو ظاہر ہے کہ تحریر کی ارتقا یافتہ شکل ہے، قدیم تر انداز کو نظر انداز کر کے ترقی یافتہ صورت کو التزام کی حد تک اختیار کر لینا مخطوطے کی قدامت کے برخلاف ہے۔

زیر نظر مخطوطے کے انداز خط سے بحث کرتے ہوئے مرتب نے ایک اہم بات کہی ہے:

"بیشتر ٹ، ڈ، ڑ پر 'ط' ہی استعمال کی ہے جو موجودہ طریقہ ہے لیکن چار نقطے بھی کہیں کہیں استعمال کیے ہیں مثلاً توتے بجائے ٹوٹے۔"

اس میں ذرا سہو ہوا ہے حقیقت اس طرح ہے کہ زیر نظر نسخے میں ٹ پر ہر جگہ لازماً چار نقطے بنائے ہیں اور مرزا کا یہی طریقہ تھا، حاشیہ پر البتہ کہیں کہیں اس حرف پر بھی نقطوں کی جگہ مختصر 'ط' نظر آتی ہے اور یہ مرزا کے طریقہ کے خلاف ہے۔

ڈ، ڑ پر مرزا بالعموم مختصر 'ط' بناتے رہے ہیں لیکن ان کی آخر عمر کی تحریروں میں بھی کہیں کہیں ڈ پر دو نقطے (ڈ) نظر آتے ہیں، متوقع یہ ہے کہ قدیم تر تحریروں میں یہ نقطے بنانے کا اہتمام زیادہ ہوتا لیکن زیر نظر نسخے میں کہیں ایک جگہ بھی نقطے نظر نہیں آتے، یہ التزام اغلب ہے کہ زمانہ مابعد کا ہو۔

زیر نظر مخطوطے اور مرزا کی تحریروں کے ایک نہایت اہم اور نمایاں فرق کو محسوس کر کے مرتب نے اس کی بابت جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"غالب فارسی میں ذال کے قائل نہ تھے، مگر ان کا یہ نظریہ بہت بعد کا ہے اس لئے قدیم تحریروں میں بہت سے ایسے الفاظ میں جن میں بعد کو 'ز' لکھا کرتے تھے ذال پائی جاتی ہے یہی صورت زیر نظر نسخے کی بھی ہے۔"

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس کی بابت جو تحریر کیا ہے وہ یہ ہے:

"غالب کا یہ ادبی عقیدہ تھا کہ ذال فارسی حرف نہیں ہے اسی لئے وہ سب فارسی لفظوں کو 'ز' سے لکھتے تھے۔" (دیوان غالب نسخۂ عرشی ص ۲۲۲)

یہ صحیح ہے کہ مرزا کا یہ نظریہ بعد کے زمانے کی بات ہے یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی قدیم تر تحریروں میں ذال مل سکتی ہے لیکن زیر نظر نسخے کا معاملہ مختلف ہے، اس میں ایک سے زاید امور ایسے ملتے ہیں جو اس کی قدامت کے برخلاف ہیں، اس لئے اب اس مخطوطے میں مرزا کے بعد کے مسلک تحریر کی توقع بے جا نہیں ہے، اس کا زمانہ کتابت جو متعین کیا گیا ہے قیاس پر مبنی ہے اور قیاس ایک حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لئے بمشکل ہی جواز پیش کر سکتا ہے اسی طور پر مرزا کے ایک خط کے حوالے سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے:

"خرشید کا املا خورشید مشہور ہے مگر میرزا صاحب نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ اس لفظ کو تنہا 'خور' اور بحالت ترکیب 'خرشید' لکھنا اچھا سمجھتے ہیں"

(نسخۂ عرشی ص ۲۱۷)

اور زیر نظر نسخے میں بالالتزام خورشید کو مع الواو لکھا ہے مثلاً

ع جلوۂ خورشید سے ہے گرم پہلوئے ہلال

ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی مرزا کے مسلک کے خلاف ہے

مرتب نے زیر نظر مخطوطے کے 'املا' کے سلسلے میں ایک اہم خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ

"کہیں تلفظ کے مطابق املا ہے، کہیں اس کے برعکس مثلاً:

دام سبزے میں ہے پرواز چمن تسخیر کا"

آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ (باقی ۸ پر)

مراسلات

کیا اردو ہندوستان کی زبان ہے؟

بے شک اردو سرزمین ہند کی پیداوار ہے۔ لیکن اردو والے اپنی اصل ماں کو چھوڑ کر انگریزی دائی کا دودھ پینا پسند کرتے ہیں۔ یقیناً بات کڑوی لگے گی۔ مگر حقیقت سے چشم پوشی بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ اب یہی دیکھئے نا، نقشال باڑی کو انگریزی کے توسط سے ہم نکسل باڑی لکھتے ہیں۔ دنڈکارنیہ کو ڈنڈا کرنیہ لکھتے ہیں، اسم کو ہم پچھلی ایک صدی سے آسام لکھتے آ رہے ہیں۔ غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تاریخ اور کیا جغرافیہ، ہر جگہ ہم انگریزی کی پیروی کرتے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں۔ سرور صاحب کو امریکہ کی سیر کی فرصت ہے لیکن اتنی مہلت نہیں کہ سارے ملک میں پھیلی ہوئی شاخوں کی مدد سے اشخاص اور مقامات کے اسماء کی ایک جامع متلفظ فہرست تیار کر ڈالیں، اصل مقامی تلفظ والی، انگریزی کے ساتھ۔

کلکتہ — اقبال کرشن

فاخر حسین صاحب کے بارے میں

فاخر حسین صاحب اصلاً لکھنوی ہیں اور آج کل لندن یونیورسٹی کے کوئنس کالج میں استاد ہیں۔ اور آپ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ شعر بہت کم کہتے ہیں۔ مگر جب قلم کو حرکت دیتے ہیں تو رنگ جمال کھنچتا اٹھتا ہے، فاخر صاحب سے ۱۹۶۷ء میں میری ملاقاتیں رہیں۔ پیرس میں وہ ایک سال کے لئے مقیم تھے۔ آج ان کی ایک نظم ڈھونڈے سے مل گئی ہے، جو انھوں نے عنایت حسین صاحب شاداں (کانپوری ثم برٹش، آج کل مقیم امریکہ) کے اعزاز میں سنائی تھی۔ ہندوستان کے شہزادۂ اردو کی خدمت میں نذر کرتا ہوں۔ نظم سوئٹزرلینڈ میں لکھی گئی تھی۔

مرزا سعید الظفر چغتائی

دشت گلزار

از فاخر حسین

آج یہ وادی پر خواب ہاں لطف کرم　　دل کی دنیا کی طرح ایک سے وارفتہ ہوش
ساز فطرت ہے کہ پرسوز فضا کی آغوش　　چار سو جیسے غم آلود ہواؤں کا خروش

دشت گلزار تھا پہلے جو ادھر سے گزرے
راہ پر خار سے ہنستے ہوئے گاتے نکلے
زندگی ایک جواں خواب تھی گلشن گلشن
پھول چنتے رہے، کہسار بھی سر کر ڈالے
اب یہی موڑ ہے دیکھو کے حیران سے ہیں
اپنی شادابیٔ دامن پہ پشیمان سے ہیں
راہ ویراں پہ ہے افسردہ درختوں کی قطار
تیری فرقت میں تڑپتی ہوئی موجیں جیسے
راہ تکتی ہیں کہ کب ان پہ ترا عکس پڑے
دیکھئے کب وہ قدم کب وہ نظر لوٹ پڑے

اتفاقات کی کڑیوں میں اسیر زنجیر　　گر کبھی ہو بھی گئی دل سے تم خواہش سفر
وہی شاداب نگاہیں وہی جام سرشار　　وہی شانوں پہ نئے رحم و کرم کے سو بار
گل پژمردہ کی خستگی میں طراوت کا گزر

صفحہ ۷ سے آگے

"ایک آدھ املے کی غلطی بھی ہے مثلاً ارادہ کو ارادا، تعالیٰ کو تعالا لکھا ہے اور یہ دوسری مثال تو ان کی عربی سے ناواقفیت کی بھی دلیل ہے۔"

(مقدمہ ص ۲)

حقیقت یہ ہے کہ ارادہ کو ارادا اور تعالیٰ کو تعالا لکھنا تلفظ کے مطابق املا کی مثالیں ہیں اور یہ صورت مرزا کی تحریروں میں عام ہیں چنانچہ نقشہ کو نقشا، رستہ کو رستا ان کے خطوط میں بھی لکھا ہوا ملے گا۔ ان مثالوں کو عربی یا فارسی سے مرزا کی عدم واقفیت کے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا، ان کے عہد کے بعض اہل علم طوبیٰ، موسیٰ، معلیٰ کو طوبا، موسا، معلا لکھتے تھے اور اس کو صحیح بھی جانتے تھے، زیر نظر نسخے میں جو بات کھٹکتی ہے یہ ہے کہ اضافت کے مقام پر یائے حطی لکھی ہوئی ہے مثلاً۔

ع　بیا ضو دیدۂ آہو کف سیلاب ہو جاوے
(ص ۱۰۵)

ع　حسنی خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
(ص ۳۸)

اردو سے معمولی واقفیت رکھنے والے کو بھی "حسنی خود آرا" اور "حسنے خود آرا" کے فرق سے واقف ہونا چاہئے، مرزا کی فارسی سے واقفیت بلکہ مہارت پر شک نہیں کیا جا سکتا، ان سے اس بات کی توقع نہیں کہ وہ خود اپنے اشعار کی تحریر میں یہ غلطی کرتے۔ بظاہر یہی غلطی اگر ان کی نگاہ سے کبھی گزر جاتی تو وہ اسے لازماً درست کر دیتے۔ لیکن زیر نظر نسخے میں یہ غلطی موجود ہے چنانچہ ایک مقطع یہ بھی ہے ؎

ہے مست امتحاں ہوس طپیدۂ اسد
اے جوشش عشق بادۂ مردآزما مجھے　(ص ۵۰)

میری گزارش ہے کہ ان امور پر غور کیا جائے۔

اخبار و افکار

اردو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ گجرال

مرکزی وزیر مملکت برائے اطلاعات و نشریات جناب آئی کے گجرال نے حیدرآباد میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ اردو زبان عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر کبھی مردہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی زبان کو آکسیجن دے کر زندہ رکھا جا سکتا ہے بلکہ تازہ فضا میں نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر کوئی بھی زبان زندہ رہ سکتی ہے جب تک کسی زبان کے بولنے والوں میں جذبات ہوں وہ زبان مردہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جذبات اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک انسان میں جدو جہد اور جستجو باقی رہتی ہے اور وہی زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔

• اردو نامہ

جناب گلزار اور شاہین کے ساتھ ایک شام

دلی اسکول کے ممتاز شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اور نئی نسل کے مشہور شاعر شاہین غازی پوری کی آمد پر شمس الزماں کے مکان پر شام غزل کا اہتمام کیا گیا۔ مصری نوجوان شاعر جناب عبد التواب الطحاوی بھی شریک بزم تھے۔ شمس صاحب نے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا۔ ابتدائی بات چیت کے دوران شاہین صاحب نے پاکستان کے نئے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جہاں اردو شعر و ادب سیاسی تحریکیں جنم لے رہی ہیں اور پروان پڑھ رہی ہیں وہیں مجموعی طور سے اس زبان کے لئے بڑے ناسازگار حالات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ محفل شعر کی صدارت گلزار دہلوی نے فرمائی۔

جناب عبد التواب الطحاوی نے اپنی عربی نظمیں سنائیں اور ان کا خلاصہ انگریزی میں بھی پیش کیا۔ اس موقع پر ادب دوستوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

• معصوم شرقی

بجنور میونسپل بورڈ اور اردو

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت اتر پردیش پر چالیس اردو پڑھنے والے بچوں پر ایک اردو ٹیچر کے تقرر کا اختیار تمام میونسپل بورڈوں کو دیدیا ہے بجنور اردو کا علاقہ ہے اور ریاستی سرکار نے بھی بجنور کو اردو کا علاقہ تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر تعجب خیز، ناقابل قبول اور افسوسناک ہے کہ چیئرمین صاحب نے پانچ مردوں اور پانچ خواتین یعنی کل دس اردو ٹیچرس کا تقرر کیا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ بجنور میں صرف چار سو بچے اردو پڑھنے کے خواہاں ہیں جبکہ یہ بات کسی بھی طرح درست نہیں ہے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ لڑکوں کو پڑھانے کے لئے دس اساتذہ مقرر کرنے تھے لیکن کمشنر سے اجازت چاہتے وقت کل "دس" لکھا گیا ہے جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کل تعداد دس پڑھانے والوں کی بھی جانے کی وجہ سے دس کے تقرر کی اجازت آگئی اگر یہ سچ ہے تو یہ بات انتہائی افسوسناک ہے اور چیئرمین صاحب اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں اور ان کی اس بھول سے اردو دوست طبقہ کو دلی اور روحانی صدمہ پہونچا ہے جس کی تلافی اسی وقت ممکن ہے جبکہ چیئرمین صاحب اردو پڑھنے والے بچوں کی صحیح فہرست مرتب کرا کے مزید پڑھانے والوں کا تقرر کریں۔

• مدینہ

ماہنامہ آندھرا پردیش کا اردو ایڈیشن

حیدرآباد:۔ ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ جناب پی۔ واس راؤ نے کہا ہے کہ سرکاری ماہنامہ "آندھرا پردیش" کے اردو ایڈیشن کی اگست سے ماہانہ باقاعدہ اور مقررہ تاریخ میں پابندی اشاعت اور تقسیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جناب واس راؤ نے آج "اسٹاف رپورٹر رہنمائے دکن" سے ایک ملاقات میں یہ بیان کیا ہے کہ اردو ایڈیشن کے معیار میں بہتری اور اچھے مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں وہ خود راست اور شخصی توجہ کر رہے ہیں۔

• رہنمائے دکن

اردو تحریک کے لئے دھمکی آمیز لہجہ نقصان دہ

حیدرآباد:۔ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ نے کہا ہے کہ اردو کا مسئلہ جمہوریت کے تحفظ کا مسئلہ ہے اردو، ہندوستان کی مسلمہ قومی زبانوں میں شامل ہے۔ اس لئے حکومت ہند کو اس کے تحفظ اور اس کی ترقی سے گہری دلچسپی ہے انھوں نے ان افراد اور اداروں کو اردو کا دشمن قرار دیا جو اردو کے نام پر دھمکی کے لب و لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر راؤ کل رات ادارۂ ترقی ادب کے زیر اہتمام منعقدہ ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ مرکزی وزیر تعلیم نے کہا کہ سہ لسانی فارمولے کے بارے میں ہندی یا انگریزی کو لسانی اقلیت کے طلبہ کے لئے اختیاری زبان بنانا ایک کل ہند سطح کا مسئلہ ہے۔ اس لئے اس تجویز کو حکومت ہند کے اردو بورڈ سے رجوع کیا جائے گا تاکہ وہ اس کے نتائج و عواقب کا جائزہ لے۔ انھوں نے شخصی طور پر اس تجویز کو قابل عمل تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح ہندی کو نظر انداز کر دئے جانے کا خطرہ ہے۔ جونیر کالجس میں ٹکٹ تک (انٹرمیڈیٹ) کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مرکزی وزیر تعلیم نے کہا کہ یہ بھی صرف

اردو والوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دوسری لسانی اقلیتیں بھی اس مسئلہ سے دوچار ہیں، حکومت کوشش کر رہی ہے کہ انٹرنیشنل ٹکنیکس کا مسئلہ جلد سے جلد طے کر دیا جائے۔ ڈاکٹر راؤ نے اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اردو تحریک کو غیر مذہبی بنائیں انھوں نے کہا کہ اردو کے نام پر "دھمکی کی زبان" قابل قبول نہیں کیونکہ اردو کا مسئلہ قومی مسئلہ ہے کوئی مسلم مسئلہ نہیں۔

اردو نے ہندوستان کی سرزمین میں جنم لیا ہے اور اردو ادب کے سرمایہ میں اضافے کے لئے ہندو ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے بھی اپنا خون دل دیا ہے۔ اس لئے اردو کو اپنے فرقہ وارانہ احساسات کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے ڈاکٹر راؤ نے کہا اردو کی کوئی ریاست نہیں گو ہر ریاست میں اس کی عملداری ہے اس لئے اردو کے کچھ عجیب و غریب مسائل ہیں جن کو اردو کے خیر خواہ مل جل کر طے کر سکتے ہیں۔ بگڑا احتجاج اور جہاد کے نعروں سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے نام پر ہی تقسیم سے پہلے نفرت کی ایک تحریک کھڑی کی گئی۔ نتیجتاً ملک تقسیم ہوا۔ مگر اب ہندوستان میں نہ کوئی جناح پیدا ہو سکتا ہے نہ اب کوئی پاکستان بن سکتا ہے۔ مغلوں کے دور میں اردو کا فروغ رہا نظام کے دور میں حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو رہی اب جو تبدیلی ہوئی ہے اس سے کچھ لوگوں میں احساس محرومی ہے۔ مگر حالات کے درست تجزیہ سے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ریاستی وزیر تعلیم جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے سہ لسانی فارمولے کے لسانی اقلیتوں پر بوجھ بننے کا تذکرہ کیا اور کل ہند سطح پر اس مسئلہ کی یکسوئی پر زور دیا۔

• رہنمائے دکن

بی اے جنرل میں اردو کا انتظام

جلگاؤں:۔ خاندیش ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں کے زیر اہتمام ایم۔ جے کالج جلگاؤں میں بی۔ اے تک شعبۂ اردو کو توسیع دیدی گئی اس سے طلبہ کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ طلبہ کی کثیر تعداد باوجود خواہش بی۔ اے میں اردو سے محروم رہتی تھی اب وہ اردو بحیثیت ایک مضمون کے لے سکتی ہے۔

• الجمعیۃ

اردو مثل دریا رواں دواں زبان

حیدرآباد ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ مرکزی وزیر تعلیم نے کہا ہے کہ ایک زندہ زبان ایک دریا کی طرح ہوتی ہے تالاب کی طرح ساکت نہیں ہوتی۔ اردو بھی ایک زندہ زبان ہے ایک دریا کی طرح جس میں معاون ندیاں آکر ملتی رہتی ہیں اور جو بہتا، پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے اس کا پانی پاک سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دریاؤں کو مقدس سمجھا جاتا ہے مردہ زبان کی جگہ میوزیم میں ہوتی ہے۔ اور کوئی سندھ یا خالص زبان ہی مردہ زبان کہلائی جا سکتی ہے زندہ زبان تو وہ ہوتی ہے جو دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرتی اور پروان چڑھتی رہتی ہے۔

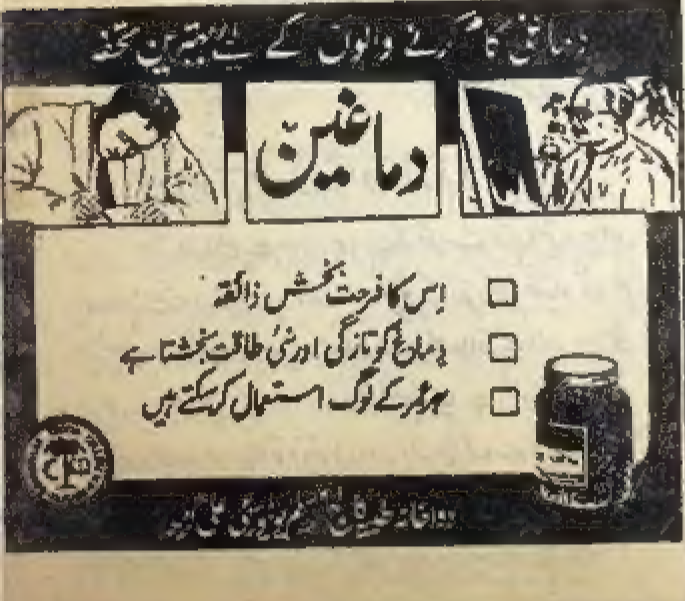
اردو کی مقبولیت اور اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ کوی سمیلن کے مقابلہ میں اردو کے مشاعرے زیادہ لطف دیتے اور کامیاب رہتے ہیں۔

• رہنمائے دکن

ہندوستان میں ہمہ لسانی تحریک کے آغاز کی ضرورت

حیدرآباد:۔ مرکزی وزیر تعلیم پروفیسر وی کے آر وی راؤ نے یہاں ہندوستان میں ایک ہمہ لسانی تحریک کے شروع کئے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "میری خواہش ہے کہ عوام اپنی رضا و رغبت کے ساتھ ہندوستان کی متعدد زبانوں کے سیکھنے کی کوشش کریں"

انھوں نے کہا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اس لئے ایک اچھے ہندوستانی بننے کے لئے تعلیم یافتہ شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ متعدد ہندوستانی زبانوں سے واقف رہے۔ پروفیسر راؤ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لسانیاتی موضوع ہندوستان میں بے اعتنائی کا شکار رہا ہے۔ صرف آزادی کے بعد سے ہی اس پر کچھ توجہ دی جا رہی ہے ملک کے ہمہ لسانی ہونے کے اعتبار سے عوام کو ایک سے زائد زبانیں سیکھنی ہوں گی۔ ان زبانوں سے کم سے کم وقت میں سیکھنے کے لئے انھیں عام فہم اور سہل بنا کر حقیقی



یکجہتی کی جانب ایک عظیم قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

انگریزی کی اہمیت:۔

پروفیسر راؤ نے انگریزی زبان کے سیکھنے کی اہمیت پر زور دیا انھوں نے کہا کہ ایسی صورت میں جبکہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے بہ سرعت ختم کیا جا رہا ہے صحیح تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ اچھی انگریزی میں بات چیت کی جائے لکھی اور بولی جانے والی انگریزی زبان کی تفہیم پر زور دیا جانا چاہئے مختلف ہندستانی زبانوں میں مختلف موضوعات پر ضروری معیاری ادب کی تیاری میں بہت زیادہ وقت درکار ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ اس کام سے قبل معیار کو برقرار رکھنے کے لئے طلبہ کو انگریزی کتابوں کے مطالعہ اور ان کے سمجھنے کی جانب راغب کرنے کے لئے خصوصی توجہ کی جانی چاہئے مرکزی وزیر تعلیم نے ایسے طلبہ کے فائدہ کے لئے جو انگریزی زبان میں کمزور ہوں مختصر مدتی انگریزی کورس کے شروع کرنے کی تجویز پیش کی ملک کے مستقبل کے لئے انگریزی زبان سے واقف ہونا انتہائی ضروری ہے۔ انھوں نے اگرچہ انگریزی زبان کی ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی مخالفت کی لیکن ان کے ساتھ ہی انگریزی سے واقفیت کو ضروری خیال کیا ابتداً ڈاکٹر رحیم، اوسمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے پروفیسر راؤ کا خیر مقدم کیا۔

• رہنمائے دکن

گرلس کالج اندور میں شعبہ اردو قائم کیا جائے

اندور:۔ گرلس کالج موتی طویلہ میں داخلہ لینے والی طالبات نے وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم اور دیگر ذمہ داران سے ایک مشترکہ عرضی کے تحت پرزور اپیل کی ہے کہ مذکورہ کالج میں اسی سال سے شعبۂ اردو قائم کیا جائے۔

پتہ چلا ہے کہ اس سال اڑتیس طالبات نے ہائر سکنڈری امتحان پاس کیا ہے اور ان سب نے مشترکہ عرضی پر دستخط کرتے ہوئے گرلس کالج میں شعبۂ اردو قائم کرنے کی استدعا کی ہے۔

خیال ہے کہ گذشتہ تین سال سے اس کالج میں شعبۂ اردو قائم کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے ہر سال وہاں خاصی تعداد میں طالبات اردو مضمون اختیار کرنا چاہتی ہیں لیکن حکومت کی عدم توجہی کی وجہ سے اس مسئلے کے حل نہیں ہونے سے اردو طالبات کی کثیر تعداد ہر سال مایوسی کا شکار ہوتی ہے۔

یقین ہے کہ اسی سال حکومت ان طالبات کے جائز مطالبہ کو قبول کر کے اپنی جمہوریت پسندی کا اظہار کرے گی۔

• رہنمائے دکن

الٰہ آباد میں اردو نائٹ اسکول

اردو زبان کی بقا و ترویج کے سلسلے میں اردو ایکشن کمیٹی الٰہ آباد کی ایک ہنگامی میٹنگ بر مکان جناب راز الٰہ آبادی کی زیر صدارت جناب ڈاکٹر پیر محمد صاحب منعقد ہوئی۔

جناب نصر قریشی نے زندہ قوموں کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی ارتقاء کے لئے زبان کے اہم رول پر روشنی ڈالی اور اردو زبان کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے اس کی تعلیم کو پھیلانے کی غرض سے اردو نائٹ اسکول کی تجویز رکھی جسے متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس سلسلے میں جناب راز الٰہ آبادی نے اپنی بے لوث خدمات پیش کیں اور کہا کہ یہ اسکول خاص طور پر دن بھر اپنی روزی کمانے والے محنت کش طبقے اور دیگر اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کیلئے اردو تعلیم کا انتظام کرے گا۔

اس اسکول کا آغاز بتاریخ ۲۴ر جولائی ۷۰ء سے جناب راز الٰہ آبادی کے مکان میں ہو جائے گا جس کا وقت ۷ بجے شام سے ۹ بجے رات تک ہوگا۔

• حمید قریشی سکریٹری

کتابیں ملیں

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

میگھ دوت (مہاکوی کالیداس کے میگھ دوت کا منظوم ترجمہ)

مترجم: رانا پرتاپ سنگھ رانا گنوری
ناشر: پاپولر پبلیکیشنز۔ دہلی
صفحات: ۹۶　قیمت دو روپے

سوز اقبال (ارمغان حجاز کے فارسی شعروں کا ترجمہ)

مترجم: منور لکھنوی
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی
صفحات: ۱۱۲　قیمت تین روپے

جلوۂ صد رنگ (مثنوی)

مصنف: ڈاکٹر سید عبد المجید
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز۔ دہلی
صفحات: ۸۸
قیمت: چار روپے

انتخاب غزلیات بشیر بدر (انگریزی)

مرتب و مترجم: روینیدر کمار چودھری
طابع و ناشر: میتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ
صفحات: ۱۲　قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

×××

تبصرہ

عتیق احمد صدیقی

نام کتاب : دکھنی لغات
مصنف : سید ابو تراب خطائی ضامن
ناشر : اردو لائبریری مینر ۲۴ اسٹی مارکیٹ بنگلور
قیمت : مجلد چھ روپیے صفحات ۴۰۳
اشاعت : مارچ ۷۰ء

اردو میں دکنی ادبیات کو اولیت کا شرف حاصل رہا زمانہ کی گردنے ان خزانوں کو مستور کر دیا تھا۔ گذشتہ نصف صدی دکنی ادبیات کی بازیافت کے لئے نہایت سازگار رہی ہے۔ اس بازیافت سے نہ صرف ان جواہر پاروں کو روشنی میں آنے کا موقع ملا جو اردو کے اولین ارتقائی دور کی یادگار ہیں، بلکہ ان سے اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں کم از کم دو صدیوں کا اضافہ ہو گیا۔ ان میں ابتدائی کوششیں دکنی ادبیات کے متن کی اشاعت سے متعلق تھیں اور دراصل ان کو ہی بنیادی اہمیت بھی حاصل ہے۔

چونکہ ان ادبیات کا تعلق اردو کے ایسے قدیم روپ سے تھا جو اب ماضی کا ورثہ بن چکا تھا، اس لئے فرہنگ کے سلسلے میں اکثر دقت پیش آتی تھی۔ خاصی تعداد متروک الفاظ کی تھی جن کے معنی تک رسائی بغیر رہنمائی کے ممکن نہیں تھی۔ اس لئے متن کو مدون کرنے والے ہر شخص نے متن کے ساتھ فرہنگ دینا بھی ضروری خیال کیا۔ زور صاحب (مرحوم) کے تدوینی کام سے لے کر مسعود حسین خاں صاحب کے کام تک یہی صورت رہی۔ زیر نظر "دکنی لغات" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

کتاب میں دکنی علاقہ کی اردو کے تقریباً چار ہزار الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں الفاظ ہیں، دوسرے میں محاورات و ضرب الامثال اور تیسرے میں خاص زنانہ محاورات رکھے گئے ہیں۔ ایسے الفاظ و محاورات جمع کئے گئے ہیں جو بذات خود یا اختلاف تلفظ یا اختلاف املا کے باعث جدید معیاری زبان کے لئے اجنبی ہیں۔ ان میں دیسی الفاظ بھی شامل ہیں اور عربی و فارسی سے ماخوذ الفاظ بھی۔ اگرچہ مقدمہ میں یہ دعا ظاہر کیا گیا ہے کہ الفاظ کے ساتھ ان کے ماخذات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے، خاص طور پر جنوبی ہند کی زبانوں سے ماخوذ الفاظ، لیکن متن میں اس کی پابندی نظر نہیں آتی۔ مثال کہیں یہ حوالہ نظر آتا ہے۔

بول چال کی زبان جو ادبی زبان سے خاصی مختلف ہے نیز مدراس و میسور کی اردو کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ مقدمہ میں اس ارادے کا اظہار ہے کہ دوسرے اڈیشن میں ان حصوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ یہ نیک فال ہے۔ دکنی اردو پر کام کرنے والوں کو اس سے مزید فائدہ پہنچے گا۔

قدیم الفاظ کے صحیح تلفظ کے اظہار کے لئے اعراب کا التزام کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ آج سے تین سو سال پہلے زبان تلفظ کی وہی صورتیں استعمال کرتی رہی ہوگی جو آج ہم ان تحریروں سے مستنبط کرتے ہیں۔ یہ شک بالخصوص اس باعث بھی پیدا ہوتا ہے کہ اردو رسم خط میں اعراب کا استعمال نہیں ہوتا بالفاظ دیگر اس میں مصوتوں کا اظہار واضح نہیں ہوتا۔ مصمتوں کی آواز پھر بھی اتنی تبدیل نہیں ہوتی، لیکن مصوتے تبدیلیوں کا اثر جلد قبول کرتے ہیں۔ مصوتوں کی معروف و مجہول اور لین صورتیں خاص طور پر معرض بحث آ سکتی ہیں۔ تلفظ کا تعین کیا جائے ان تبدیلیوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم نہیں مصنف نے کس بنیاد پر تلفظ کا تعین کیا ہے۔ تلفظ کے تعین میں اعراب نویسی بڑا نازک مسئلہ ہے، تلوار سے تیز نہ سہی مگر بال سے باریک ضرور ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس سلسلے میں قدرے اور احتیاط برتی جاتی۔

پیش لفظ و تعارف میں اسے نقش اول کی حیثیت دی گئی ہے حالانکہ اس سے پہلے شعار ہاشمی کی دکنی لغت اور نجیب اشرف ندوی کی لغت گجری شائع ہو چکی ہیں، نیز جتنے دکنی متن شائع ہوئے سب ہی میں ان کی فرہنگ بھی شامل کی گئی۔ صرف اجزا کی صورت میں منتشر ہونے سے ان کی بھی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔

ابتدا میں دکنی ادب کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور دکنی ان لسانی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، جو اسے آج کی معیاری اردو سے ممتاز کرتی ہیں۔

ضامن صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور قابل مبارکباد بھی۔ اس سے دکنی متنوں کی تفہیم میں اور دکنی کا مطالعہ کرنے والوں کو خاص مدد ملے گی۔

●

"ہماری زبان"
کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ وہ ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔اے نے لیتھو کو آپریٹو پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔
REGD-NO-L-922 - ۲۹ فون نمبر R-NO-2186/57